حقوقِ نسواں کمیٹی رپورٹ پر

تبصرہ

(۵)

از جناب ملک غلام علی صاحب

ترجمان کے اشارات میں "حقوقِ نسواں کمیٹی رپورٹ" پر جس تبصرے کا آغاز کیا گیا تھا، اس کی چوتھی قسط ذی قعدہ ۱۳۹۶ھ (نومبر ۱۹۷۶ء) کے شمارے میں شائع ہو چکی ہے جس میں رپورٹ کی دفعہ ۹۲ تک بحث کی جا چکی ہے۔ اسی ذی قعدہ کے پرچے میں راقم کا وہ مضمون بھی چھپا ہے جو صدرِ حقوقِ نسواں کمیٹی کی بعض اُن توضیحات کے جواب میں لکھا گیا تھا جو انہوں نے اکتوبر کے اواخر میں پریس میں طبع کرائی تھیں۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے تبصرہ نگار کو حج بیت اللہ اور حرم نبوی کی زیارت کی سعادت عطا فرمائی اور قریب دو ماہ کے بعد اس مبارک سفر سے واپسی ہوئی۔ اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے ہم جیسے عاجز و بے نوا پر ایسا فضل و کرم فرمایا۔ اُسی سے دُعا ہے کہ وہ اسے حج مبرور اور سابقہ گناہوں کا کفارہ بنائے، آمین۔ اس دوران میں بحمداللہ جناب عبدالحمید صدیقی صاحب کی صحت اس حد تک بحال ہو گئی ہے کہ وہ ترجمان کے اشارات لکھنے کی ذمہ داری سنبھال سکیں۔ تاہم رپورٹ پر ہماری تنقید چونکہ ابھی تک تشنۂ تکمیل ہے، اس لیے اس کا باقی حصہ مضمون کی شکل میں پیش کیا جا رہا ہے۔

جیسا کہ بیان ہوا حقوقِ نسواں کمیٹی کی رپورٹ کا دفعہ ۹۲ تک جائزہ لیا جا چکا ہے۔ اب ہم دفعاتِ مابعد کو لیتے ہیں۔ دفعہ ۹۳ سے لے کر دفعہ ۱۰۸ تک جو سفارشات مرتب کی گئی ہیں ان سے مقصود و مطلوب یہ ہے کہ زندگی کے ہر میدان میں عورتوں کو مردوں کے شانہ بشانہ لا کر کھڑا کر دیا جائے اور انہیں "معاشی آزادی اور تمدنی استقلال" سے پوری طرح بہرہ اندوز کیا جائے۔ کمیٹی نے اپنی رپورٹ

کے ابتدائیہ ہی میں یہ بات واضح کر دی تھی کہ اس کے امورِ مفوّضہ یہ ہیں کہ :

" پاکستانی خواتین کی معاشرتی و معاشی حالت کو بہتر بنانے کے لیے قانونی اصلاحات پیش کی جائیں کیونکہ موجودہ دور میں اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین ، جو کام کرنے کی خواہشمند ہیں ، اُن کے لیے بھی حکومت کی ملازمتوں ، سرکاری اور دیگر دفاتر میں پائے جانے والے ماحول اور حالاتِ کار کے ساتھ اپنے آپ کو ہم آہنگ کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے ۔"

کمیٹی اور اس کے حدودِ کار متعین کرنے والے اربابِ اختیار نے جن اعلیٰ مقاصد و خواہشات کا اظہار فرمایا ہے اُن کا مطلب جو کچھ ہم سمجھ سکے ہیں وہ یہ ہے کہ مختلف تدابیر اختیار کرنے کے باوجود ابھی تک پاکستان کے مسلمان معاشرے پر تاریک خیالی اور رجعت پسندی طاری ہے ۔ مرد اور عورت دونوں کی راہ میں ایسی ذہنی اور خارجی رکاوٹیں اب تک موجود ہیں جن کے باعث عورت شمعِ انجمن بننے کے بجائے بس چراغِ خانہ بن کر رہ گئی ہے ۔ ہمارے ہاں مخلوط تعلیمی نظام رائج ہے ۔ بہت سی درسگاہیں ایسی ہیں جہاں طلبہ و طالبات کو یکجا پڑھایا جاتا ہے ۔ پڑھانے والے مرد بھی ہیں ، عورتیں بھی ہیں معلّمات و طالبات میں ایسی بھی ہیں جو نہ چہرہ ڈھانکتی ہیں ، نہ بال چھپاتی ہیں ، نہ لباس و جسم کی دوسری زینت کو مخفی رکھتی ہیں ۔ اُستاد ، شاگرد ، اور ہم مکتب نگاہیں نیچی رکھنے کے بجائے ایک دوسرے سے بےحجابانہ بول چال اور میل جول رکھتے ہیں ۔ اس کے باوجود جب لڑکیاں تعلیم سے فارغ ہوتی ہیں تو وہ دفاتر یا صنعتی و کاروباری اداروں میں ملازمت کرنے ، سیاسی سرگرمیوں ، اور جلسے جلوسوں میں شرکت کرنے کے بجائے بس گھروں میں بیٹھ جاتی ہیں ۔ باہر نکلنے اور مردوں کے ساتھ قدم ملا کر چلنے کی ہمت نہ وہ خود کرتی ہیں ، نہ مرد ہی اُن کی اس معاملے میں ہمت افزائی کرتے ہیں ۔ کمیٹی کے ارکان اس صورتِ حال سے ناخوش ہیں اور اسے بدلنے کی خواہش رکھتے ہیں ۔ لیکن اس صورتِ حال کی تبدیلی کن مراحل سے گزرے گی اور کس انتہا تک پہنچے گی یہ اہلِ نظر سے مخفی نہیں ہے ۔

ہر شخص جو دُنیا کے حالات اور تہذیب حاضر کے اساسی نظریات سے واقف ہے وہ یہ جانتا ہے کہ مغرب کی مادہ پرستانہ اور عیاشانہ تہذیب اور اباحیت پسند تمدن کی بنیاد ایک فکری و نظری تثلیث پر رکھی گئی ہے ۔ اس تثلیث کے اقانیمِ ثلاثہ یہ ہیں :۔ عورت اور مرد کے مابین نام نہاد مساوات ، عورت کی معاشی اُٹھان اور اس کا اقتصادی استقلال اور عورت و مرد کا آزادانہ اختلاط ۔ ان تینوں عناصر کا

چولی دامن کا ساتھ ہے اور ان میں سے ہر ایک عنصر دوسرے کو سہارا دیتا ہے اور اس سے سہارا لیتا ہے۔ مغربی معاشرے نے ان تینوں اصولوں کو خوب اچھی طرح برت کر اور پرکھ کر دیکھ لیا ہے۔ نتیجہ جو کچھ نکلا ہے وہ یہ ہے کہ عورت کی عفت اور اس کے ساتھ مرد کی پاکدامنی تار تار ہو کر رہ گئی ہے۔ مگر جو غیر فطری جنسی تونس دونوں کو لگ چکی ہے وہ کسی طرح بجھنے اور ختم ہونے میں نہیں آتی۔ فواحش کا ارتکاب اب کھلم کھلا ہو رہا ہے اور نت نئی شکلیں اختیار کر رہا ہے۔ امراض خبیثہ نے ایک وبا کی صورت اختیار کر لی ہے۔ ازدواجی زندگی میں وفاداری برائے نام بھی باقی رہتی نظر نہیں آتی۔ اولادِ حلال کی پیدائش کم اور اولادِ حرام کی پیدائش زیادہ ہو رہی ہے۔ خاندانی نظم و ضبط کے فقدان کی بدولت کم سن لڑکوں اور لڑکیوں کے جرائم روز افزوں ہیں۔ پھر جس معاشی آزادی کے حصول کے لیے عورت گھر سے نکلی تھی یا اُسے نکالا گیا تھا، وہ آزادی اب مَعاشی مسابقت سے بڑھ کر مَعاشی غلامی کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ گھر کا عائلی نظام اور گھر سے باہر کا معاشرتی و اجتماعی نظام، جو تقسیمِ کار اور فرقِ مراتب کا طلبگار ہے، وہ بالکل ابتر اور تلپٹ ہو کر رہ گیا ہے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ ہمارے ہاں مغرب کے مقلدین اہلِ مغرب کی کورانہ نقالی پر تُلے ہوئے ہیں اور اس کا نام انہوں نے آزادیٔ نسواں رکھ چھوڑا ہے کیونکہ اُن کے فرنگی پیشواؤں نے اس کا یہی عنوان تجویز کر دیا ہے۔

ہم اس بات کو پہلے واضح کر چکے ہیں کہ اسلام نے عورت کے اپنے نان و نفقہ یا اس کے اہل و عیال کے اخراجات کا بوجھ کسی صورت میں بھی عورت پر نہیں ڈالا بلکہ اُسے مرد یا بدرجۂ آخر بیت المال پر ڈالا ہے۔ عورت کا گھر کے اندر رہتے ہوئے امورِ خانہ داری سرانجام دینا، گھریلو معاملات میں افرادِ خانہ کی اعانت کرنا، ازدواجی زندگی میں حمل و ولادت اور بچوں کی رضاعت و تربیت کی نازک ذمہ داریاں نباہنا — یہ عورت کا اوّلین فریضہ ہے جو کہ ہمہ وقتی مشغلہ (WHOLE TIME JOB) ہے۔ یہ اپنی اہمیت و افادیت اور قدر و منزلت کے اعتبار سے مرد کے فرائضِ حیات سے کسی صورت میں کمتر و فروتر نہیں ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ دائرۂ کار کی یہ تفریق و تقسیم صرف شہری زندگی میں ممکن ہے۔ دیہات کی عورتیں ہمیشہ گھروں سے باہر نکل کر کھیت، کنوئیں اور تالاب پر جاتی ہیں اور مردوں کے ساتھ کام کرتی ہیں۔ مگر یہ ایک طرح کا مغالطہ ہے۔ دیہات میں مرد اور عورت دونوں کی زندگی بالعموم اپنے ہی گاؤں تک محدود رہتی ہے۔ عورت اگر گھر سے باہر نکلتی بھی ہے تو وہ محرم مردوں یا

جان پہچان کی عورتوں کے ساتھ رہتی اور کام کاج کرتی ہے۔ پھر وہاں کی زندگی ایسی کٹھن اور پُرمشقت ہے کہ عورتوں کے لیے بن ٹھن کر نکلنا اور زیب و زینت کے ساتھ گھومنے پھرنا کم ہی ممکن ہوتا ہے۔ وہاں ابھی تک ایسے دفاتر، کارخانے اور اجتماعی زراعت کے فارم وغیرہ بھی نہیں ہیں جہاں غیر محرم مرد اور عورتیں کئی کئی گھنٹے تک اپنے گھروں اور گھریلو ماحول سے دُور اور اپنے مَحارم و اَعِزّہ کی نگاہوں سے اوجھل ایک دوسرے سے خلط ملط ہو کر رہیں۔ اس لیے اب تک کی دیہاتی فضا میں عورت گھر سے باہر نکل کر بھی ایک محدود و مانوس دائرے ہی میں رہتی ہے۔ وہ معاشی آزادی کے دلفریب اور مسحور کُن نعرے سے متاثر ہو کر کسی بالکل اجنبی اور دُور دراز مقام پر جا کر غیر محرم مردوں کی ماتحتی اور رفاقت میں تنخواہ پر کام نہیں کرتی بلکہ گھر سے باہر بھی اپنے گھر ہی کا کچھ کام کاج کرتی اور گھر والوں کا ہاتھ بٹاتی ہے۔

لیکن حقوقِ نسواں کمیٹی کو جو اصل فکر اور پریشانی لاحق ہے وہ یہ ہے کہ " اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین، جو کام کرنے کی خواہشمند ہیں، اُنھیں دفاتر میں پائے جانے والے ماحول کے ساتھ ہم آہنگ کیا جائے"۔ چنانچہ کمیٹی کی رپورٹ کی دفعہ ۹۳ کہتی ہے:

" ملک میں صنعت کے فروغ اور روز افزوں تجارتی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ عورت کو ایک نمایاں کردار ادا کرنا ہے"۔

یہ نمایاں کردار کیا ہے جو کمیٹی کے بقول پاکستان کی مسلمان عورت کو ادا کرنا ہے؟ اس کی کچھ تفصیل ہمیں رپورٹ کی دفعہ ۹۶ اور دفعہ ۹۷ میں ملتی ہے اور وہ یہ ہے:

" جیسا کہ پہلے ہی ذکر کیا گیا ہے کہ گھروں پر عورتوں کی ضرورت سے زیادہ مصروفیات، بالخصوص جب کہ ان کو چھوٹے بچوں کی نگہداشت کرنی پڑتی ہو، گھروں سے باہر کُل وقتی یا جُز وقتی ملازمت کرنے میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ثابت ہوتی ہے اور ملک میں سرکاری پرورش گاہوں اور دن کے وقت دیکھ بھال کے مراکز کی عدم موجودگی ان عناصر میں سے ایک ہے جو عورتوں کو ایسی ملازمت کرنے کی حوصلہ شکنی کرتے ہیں جن سے وہ اپنی معاشرتی و معاشی حیثیت کو بہتر بنانے میں مدد لے سکتی ہوں۔ اس لیے محنت کش ماؤں کے لیے بچوں کی سرکاری پرورش گاہوں کی اشد ضرورت ہے"۔

مدعا یہ ہے کہ جو خواتین تعلیم یافتہ ہیں اور اس بات کی خواہش مند ہیں، یا جن کے اندر یہ خواہش پیدا کی جائے گی، کہ وہ گھروں میں ضرورت سے بڑھ کر مصروف نہ رہیں بلکہ گھر سے باہر نکلیں اور

"کارخانوں، صنعتی اداروں اور تجارتی تنظیموں میں ملازمت" تلاش کریں، تو ایسی صورت میں اگر وہ غیر محرم مردوں کی نظر بازی اور ہوا وہوس کا نشانہ بنیں اور شرعی و اخلاقی حدود وقیود پامال ہوں تو اس کی کوئی فکر حقوقِ نسواں کمیٹی کو نہیں ہوگی ۔ البتہ کمیٹی کو اس بات کا اندیشہ ہے کہ ایسی عورتیں اگر ملازمت کے ساتھ ساتھ صاحبِ اولاد بھی ہو جائیں تو بچوں کی نگرانی کون کرے گا؟ کیونکہ ہمارے ملک میں بچوں کے لیے سرکاری پرورش گاہیں اور دیکھ بھال کے مراکز نہیں ہیں جیسا کہ مغربی، بالخصوص اشتراکی ممالک میں موجود ہیں۔ ایسی نرسریوں کی عدم موجودگی عورتوں کی ملازمت میں حوصلہ شکنی کی باعث بنے گی اور ان کی معاشی، اور معاشی سے زیادہ "معاشرتی حیثیت" بہتر نہیں بن سکے گی ۔ اس مشکل کا حل کمیٹی نے دفعہ ۹۵ میں یہ تجویز کیا ہے :

"سماجی تحفظِ ملازمین آرڈی ننس ۱۹۶۵ء کے تحت سماجی تحفظ سکیم کے ذریعے تمام شہروں میں سرکاری پرورش گاہوں، دن کے وقت دیکھ بھال کرنے والے مراکز اور نرسریوں کے قیام کے لیے اہتمام کیا جائے"۔

یہ سرکاری پرورش گاہیں یا پبلک نرسریاں جن کے قیام کی تجویز کمیٹی نے پیش کی ہے ان کے لیے انگریزی اور دوسری مغربی زبانوں میں "کریش" (CRECHE) کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور یہی لفظ انگریزی رپورٹ میں درج ہے ۔ یہ لفظ دراصل کریچ (CRATCH) کی ایک "ترقی یافتہ" صورت ہے، اور کریچ اُس برتن یا ریک وغیرہ کے لیے آتا ہے جو گھر سے باہر پالتو جانوروں کی خوراک، دودھ، پانی وغیرہ کے لیے رکھ دیا جاتا ہے ۔ مغربی معاشرے میں چونکہ ڈارون، فرائڈ اور ان کے متبعین نے انسان کو حیوان بلکہ حیوان سے بھی پست تر مخلوق کا درجہ دے رکھا ہے، اس لیے ان کے ہاں اس بات میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، بلکہ یہ عین مطلوب ہے کہ دفاتر اور کاروبار کے اجتماعی مراکز میں نر، مادہ، حاملہ، شیر دار سب کو جمع کر کے کام میں جوت دیا جائے، البتہ جو محنت کے قابل نہ رہے اُسے کچھ ستانے کا موقع دیا جائے، اور جس کا بچہ چھوٹا ہو اُس کے بچے کو ایسے دوسرے بچوں کے ساتھ قریب کے کسی باڑے میں بند رکھا جائے اور اُسے کھلانے پلانے کا انتظام کیا جائے، بالکل اُسی طرح جس طرح حیوانات کے چھوٹے بچوں کو ماں سے جدا کر کے رکھا جاتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ جانوروں کے کھانے پینے کے لیے مستعمل ظرف کا جو نام اہلِ مغرب نے تجویز کیا ہے، وہی انہوں نے ملازم عورتوں

کے دار الاطفال کے لیے پسند کیا ہے اور اُسی نام کو ہماری اس کمیٹی نے اپنایا ہے جو حقوقِ نسواں کی نشاندہی کر رہی ہے۔ اس کے بعد ہر مسلمان بآسانی یہ اندازہ کر سکتا ہے، بالخصوص ہماری خواتین اس بات کو بخوبی سمجھ سکتی ہیں، کہ اُنہیں اور ان کی اولادِ صغار کو گھر سے نکال کر کس ماحول اور کس نظام کے حوالے کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اگر اس کا نام آزادی ہے تو یہ وہ آزادی ہے جس کے متعلق علامہ اقبالؒ نے فرمایا ہے:

تجھے تہذیبِ مغرب نے عطا کی ہے وہ آزادی کہ ظاہر میں تو آزادی ہے، باطن میں گرفتاری

اس حقوقِ نسواں کمیٹی نے "سرکاری پرورش گاہوں" کے قیام کی سفارش تو بلا تامل کر دی ہے مگر یہ نہیں بتایا کہ ان پرورش گاہوں کو دفاتر سے کتنی دُور قائم کیا جائے گا، اُن کی تعداد اور دفاتر اور کارخانوں کی تعداد میں باہمی تناسب کیا ہوگا، ان میں کتنی عمر سے کتنی عمر تک کے بچے رکھے جائیں گے، آیا وہ شبانہ روز یہاں رکھے جائیں گے یا فقط دن یا رات کے وقت رہیں گے، اور ان کی ماؤں اور دوسرے عزیزوں کو ان سے کن اوقات میں کتنی دیر تک ملنے کی اجازت ہوگی؟ شاید کمیٹی کے اکثر ارکان کے دماغ میں اِن سوالات کا کوئی سوچا سمجھا متعین جواب نہ ہوگا بلکہ انہوں نے بھی "کریش" کا لفظ کہیں سے سُن یا پڑھ لیا ہوگا اور "دریں چہ شک" والے طوطے کی طرح اس کو دہرا دیا ہوگا۔ اس لیے ہم ان کی اور دوسرے قارئین کی سہولت اور معلومات کی وسعت کے پیشِ نظر سوویٹ یونین کی ایسی پرورش گاہوں سے متعلق ایک رپورٹ کے بعض اقتباسات یہاں نقل کیے دیتے ہیں جو "عائلی وجنسی انقلاب" (THE FAMILY AND THE SEXUAL REVOLUTION) نامی کتاب کے باب "یو۔ ایس۔ ایس۔ آر (روس) میں ملازم مائیں" سے اخذ کیے گئے ہیں۔ یہ کتاب انگلستان کے ناشر جارج ایلین اینڈ آن وِن نے چھاپی ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ باب مذکور کے مصنّف نے خود روس جا کر اور وہاں رہ کر حالات کا مطالعہ کیا ہے اور اس کا نقطۂ نظر اس معاملے میں مخالفانہ نہیں بلکہ موافقانہ و ہمدردانہ ہے۔ اس کتاب کے صفحہ ۲۸۵ تا ۲۹۱ پر اُس نے بچوں کی اجتماعی پرورش گاہوں کے لیے کریش ہی کا لفظ استعمال کرتے ہوئے اس مسئلے پر مفصل بحث کی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے:

"دوسرے مغربی ممالک کا ذہن "کریش" کو ایک ناگزیر مگر افسوسناک ضرورت خیال کرتا ہے۔

مگر سوویٹ روس اپنے اشتراکی طرزِ حیات اور اپنے ہاں کے اجتماعی طریقِ بود و باش کے پیشِ نظر ان بچہ گاہوں

کو ایک ایسا پسندیدہ ادارہ قرار دیتا ہے جو سوشلزم کے لوازمات میں سے ہے۔ مغرب میں تربیتِ اطفال کے جو معیارات و نظریات معروف و مسلّم ہیں، یہ چیز اُن کے منافی و مخالف ہے کہ بچوں کی مائیں ملازمت کا پیشہ اختیار کریں۔ لیکن یہ صورتِ حال سوویٹ یونین کے مسلّمہ مقاصد اور مطمح نظر کے عین مطابق ہے۔ روسی میگزین "سوویٹ وومن" میں ایک عورت گیلینا کا ایک خط چھپا ہے جس میں وہ کہتی ہے: 'اگر مجھ سے پوچھا جائے کہ آیا میں اپنی ملازمت چھوڑ دینے اور گھریلو فرائض انجام دینے کے لیے تیار ہوں تو میرا جواب یہ ہوگا کہ میں ایسا نہیں کر سکوں گی۔ فیکٹری میں ہم ایک بڑے خاندان کے ممبر بن گئے ہیں۔ وہاں میرے بہت سے پکے دوست اور بہترین اور مہربان ترین کامریڈ بن چکے ہیں'۔

ایک مثالی سوویٹ کنبے کے جملہ افراد، بوڑھے افراد کے ماسوا، سب کے سب صبح کے وقت ناشتہ کر کے گھر سے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ ماں اپنے چھوٹے بچوں کو ساتھ لیتی ہے اور انہیں اس نرسری کے سپرد کر دیتی ہے جو اس کی جائے ملازمت کے پاس ہوتی ہے۔ یہاں ڈاکٹر، نرسیں اور دوسرے خدمت گار بچے کی نگرانی کرتے ہیں۔ ماں کو معلوم ہوتا ہے کہ اُسے ضرورت کے وقت بُلایا جا سکتا ہے۔ اُسے ہر ساڑھے تین گھنٹے کے بعد اپنا بنچ یا ڈسک چھوڑنے کی اجازت ہوتی ہے تاکہ وہ جا کر بچے کو دُودھ پلا سکے۔ اس کے لیے اُسے آدھ گھنٹے کی چھٹی دی جاتی ہے اور یہ وقت اوقاتِ ملازمت میں شمار ہوتا ہے۔ بیماری کی حالت میں اُسے بچے کی تیمار داری کی اجازت دی جاتی ہے اور تنخواہ نہیں کاٹی جاتی۔

سات گھنٹے کی ڈیوٹی کے بعد ماں جا کر بچہ لے لیتی ہے اور اُسے گھر لے جاتی ہے[1] جہاں کنبہ دوبارہ یکجا ہو جاتا ہے۔ بچوں کو ان تربیت گاہوں میں کوآپریٹو زندگی کی تعلیم بھی دی جاتی ہے۔ جن بچوں کی گھروں میں انفرادی تربیت ہو وہ اُس وقت تک نرے سماجی بوجھ ثابت ہوتے ہیں جب

---

[1] دوسری شائع شدہ معلومات یہ بتاتی ہیں کہ اگر بچہ ماں کا دُودھ نہ پیے اور ماں رات کی شفٹ میں کام کرے تو بچہ رات کو بھی گھر نہیں آ سکتا۔ اگر والدین رات کو کلب یا دوستوں سے ملنے جائیں تب بھی یہی صورت ہے۔

تک کہ انہیں مساوات پر مبنی زندگی کا عادی نہ کر لیا جائے اور ان کے اندر سے انانیت اور خود غرضی کا خاتمہ نہ کر دیا جائے جو خلوت اور تنہائی کی تربیت کا نتیجہ ہوتی ہے۔[۱]

بچے والی ملازم عورت کو ایک سو بارہ ۱۱۲ ایام کی رخصت ملتی ہے جن میں سے چھپن ۵۶ روز ولادت سے پہلے اور اتنے ہی دن ولادت کے بعد گزارے جاتے ہیں۔[۲] میڈیکل سفارش پر اس میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔ حاملہ اور مُرضعہ عورتوں سے اوور ٹائم اور رات کی ڈیوٹی نہیں لی جاتی۔ انہیں ہلکا کام دیا جاتا ہے اور بھاری بوجھ نہیں اُٹھوایا جاتا۔ ان کی تنخواہ کم کرنا یا ملازمت سے علیحدہ کرنا خلاف قانون ہے۔ مگر جنسی مساوات کا اصول گھر کے اندر نہیں چلتا۔ سودا سلف خریدنا، کھانا پکانا اور گھر کی صفائی بیشتر عورت ہی کو کرنی پڑتی ہے۔ عورتوں اور مردوں کے لیے دفتری اوقات یکساں رکھے گئے ہیں۔ مگر مردوں کے بالمقابل عورتوں کا دُگنا وقت سفر اور خرید و فروخت میں اور چوگنا وقت گھریلو کام کاج میں کھپتا ہے۔ اس طرح عورتوں کو آرام، نیند، جسمانی صفائی اور سیاسی مصروفیات کے لیے مردوں سے چار گھنٹے کم وقت ملتا ہے۔ گھر میں ماں اپنے بچے کی نگرانی اور تربیت پر اوسطاً صرف آدھ گھنٹہ روزانہ اور باپ صرف پندرہ منٹ روزانہ صرف کرتا ہے۔ عورت گھر کی جھاڑ پونچھ پر یومیہ سوا گھنٹہ اور مرد صرف سولہ منٹ دیتا ہے۔ باورچی خانے میں عورتیں تقریباً ڈھائی گھنٹے روزانہ خرچ کرتی ہیں اور مرد پندرہ منٹ۔"

آخر میں مضمون نگار لکھتا ہے:

"سوویٹ روس میں ملازمت پیشہ ماں پر سے بچوں کی نگرانی کا بوجھ تو ہلکا ہو گیا ہے مگر امور خانہ داری کا بوجھ ہلکا نہیں ہوا۔ گویا ملازم ماں کا مسئلہ تو کسی حد تک حل ہوا ہے۔ مگر ملازم

---

[۱] مدعا یہ ہے کہ اس فیکٹری میں سے ہر بچہ باٹا کے جوتے کی طرح ایک ہی ذہنی ساخت میں ڈھل کر نکلے اور اس میں کوئی انفرادیت باقی نہ رہے۔

[۲] روسی حکومت کی ماسکو سے شائع کردہ کتاب "سوالات و جوابات" (QUESTIONS & ANSWERS) کے صفحہ ۲۸۱ پر بھی یہی بیان کیا گیا ہے کہ بچے والی عورت کو زمانۂ ولادت میں ۱۱۲ دن کی چھٹی ملتی ہے۔ بعد میں کام کے دوران اُسے ساڑھے تین گھنٹے کے بعد آدھ گھنٹہ کی رخصت بچے کو دودھ پلانے کے لیے دی جاتی ہے۔

بیوی کا مسئلہ حل نہیں ہو سکا۔ اس کے برعکس امریکہ میں ملازم بیوی کا مسئلہ ایک حد تک حل ہو گیا ہے مگر ملازم ماں کا مسئلہ ابھی تک لاینحل ہے"۔

یہ تو عورتوں کی دفتروں اور فیکٹریوں میں ملازمت اور بچوں کی اجتماعی پرورش کا فقط معاشی اور اقتصادی پہلو ہے جس کا صحیح حساب کتاب اور نفع نقصان اُس وقت تک معلوم نہیں ہو سکتا جب تک اُن پورے اخراجات کا بھی تخمینہ نہ لگایا جائے جو ان بچہ ساز تربیت خانوں اور اُن کے نگرانوں پر قومی خزانے سے صرف ہوں گے۔ لیکن اس مسئلے کا جو پہلو اخلاقی و روحانی ہے وہ تو اس حد تک المناک اور کرب انگیز ہے کہ دماغ کو سوچنے اور قلم کو بیان کرنے کا یارا نہیں ہے۔ تاہم اس سلسلے کے بھی نہایت واشگاف اور رپوست کندہ حالات و نتائج خود مغرب کے مصنفین نے شائع کر دیے ہیں۔ اگر ہمارے ملک میں نسوانی حقوق کا ڈھونگ اسی طرح رچایا جاتا رہا تو پھر ہم مجبوراً اس دوسرے پہلو پر سے بھی پردہ ہٹا کر دکھائیں گے کہ ایسی اسکیموں کے طفیل نسوانی عصمت اور انسانی غیرت کس بھیانک حشر سے دوچار ہو چکی ہے۔

اگر اخلاقی پہلو سے تھوڑی دیر کے لیے صرف نظر کر لیا جائے اور محض انسانی زاویۂ نظر ہی کو سامنے رکھا جائے تب بھی مساوات اور عورت کے ساتھ عدل و انصاف کا تقاضا یہ نہیں ہے کہ اس سے دُہری مشقت لی جائے۔ اُس سے گھر کا کام بھی لیا جائے، اُس پر باہر جا کر کمانے کی ذمہ داری بھی ڈالی جائے اور کمائی کی راہ میں اگر فطری نسوانی مجبوریاں حائل ہوں تو انہیں محض اس قسم کی سطحی اور خلافِ فطرت تدابیر سے حل کرنے کی کوشش کی جائے کہ ملازم خواتین کو حمل و ولادت کے لیے تین یا چار ماہ کی بانتخواہ چھٹی دے دی جائے۔ اس کے بعد ان کے بچوں کو دفتر سے ملحق نرسری میں ڈال دیا جائے اور جب وہ بھوک سے بلکنے لگیں تو سُرخ جھنڈی ہلا دی جائے اور ماں فوراً دفتر یا فیکٹری سے اُٹھے، جا کر بچے کو دودھ پلائے اور پھر دفتر میں آکر رپورٹ کرے۔ اس طرح کے انسانی ڈیری فارموں میں جس نسل کی پرورش ہوگی وہ دو ٹانگوں والے اشتراکی یا سرمایہ پرست جانور تو ہو سکتے ہیں، مگر وہ شفیق و حلیم انسان اور متقی مسلمان مشکل ہی سے بن سکتے ہیں۔ اسلام نے تو مسلمان خاوند کو یہ تعلیم دی ہے کہ وہ اپنی بیوی بچوں کے لیے خود کما کر لائے، اگر بیوی کو طلاق دے تب بھی عدت کے دوران میں مطلقہ کے اخراجات پورے کرے اور چھوٹی اولاد ہو تو ماں کے سپرد ہونے کے باوجود اس کا نان و نفقہ بھی

مہیا کرے۔ لیکن یہ نسوانی حقوق کی کمیٹی عورت کو یہ اُلٹا سبق سکھا رہی ہے کہ وہ جائے اور اجنبی مردوں کی نگرانی اور ہم نشینی میں اپنی معاش خود تلاش کرے۔

یہ کمیٹی بار بار یہ اعلان کرتی ہے کہ ہم عورتوں کو صرف وہ حقوق دلانا چاہتے ہیں جو اسلام نے دیے ہیں مگر مردوں نے چھین لیے ہیں۔ حالانکہ اس کمیٹی کی ہر تجویز مغرب کی بھونڈی اور بے مغز نقالی ہے۔ ہمارے ملک میں اب تک بلا مبالغہ لاکھوں اعلیٰ تعلیم یافتہ جوان بے روزگار پھر رہے ہیں۔ عورتوں کا معاشی و معاشرتی مرتبہ بلند و بالا کرنے سے پہلے کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ ان بے کار مردوں کو کام پر لگایا جائے؟ یہ بھی تو آخر کسی ماں کے بیٹے، کسی بہن کے بھائی یا کسی بیوی کے خاوند ہوسکتے ہیں۔ انہیں روزگار فراہم کر دینے سے کیا بہت سی بے سہارا خواتین کو آسرا نہیں مل سکتا؟ پھر ان کے معاملے میں بچہ جننے اور پالنے کا جھگڑا بھی نہیں۔ مگر اُن کی فکر اتنی نہیں ہے جتنی "محنت کش ماؤں اور ان کے بچوں کی سرکاری پرورش گاہوں" کی فکر اور پریشانی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مغربی ترقی یافتہ ممالک میں ہر عہدہ دار اور ہر افسر کے پہلو میں لیڈی سکرٹری براجمان ہے اور ہر دفتر میں مرد کے شانہ بشانہ عورت بیٹھی ہے، مگر ہمارے ہاں ہی ایسی تاریکی ہے کہ چراغ لے کر ڈھونڈھنے سے بھی کسی فیکٹری یا دفتر میں کوئی عورت اور پھر تعلیم یافتہ عورت مشکل ہی سے ملتی ہے۔

حقوق نسواں کمیٹی نے سماجی تحفظِ ملازمین آرڈیننس ۱۹۶۵ء کے علاوہ ۱۹۵۸ء کے ایک آرڈیننس میں بھی ترمیم تجویز کی ہے۔ اس آرڈیننس کا انگریزی عنوان (MATERNITY BENEFITS ORDINANCE) ہے جس کا ترجمہ اُردو رپورٹ میں مغربی پاکستان انتفاعاتِ زچگی آرڈیننس کیا گیا ہے۔ "انتفاعاتِ زچگی" کی ترکیب ناموزوں اور غیر شستہ ہے۔ اس کے بجائے "مراعاتِ ولادت" یا اس طرح کے دوسرے الفاظ زیادہ مناسب تھے۔ بہرکیف ۱۹۵۸ء کا یہ قانون ان فیکٹریوں پر لاگو ہوتا ہے جو ۱۹۳۴ء کے فیکٹری ایکٹ کے تحت کارخانے شمار ہوسکتے ہیں اور جن میں کم از کم بیس ملازمین کام کرتے ہیں۔ کمیٹی کی خواہش یہ ہے کہ جن صنعتی اور تجارتی اداروں میں دس سے زائد ملازمین موجود ہوں اُن پر بھی ۱۹۵۸ء کے فرمان کا اطلاق کرکے وہاں کی ملازم خواتین کو وہ تمام مراعات دی جائیں جو زچگی، ولادت وغیرہ سے متعلق ۱۹۵۸ء والے قانون میں دی گئی ہیں۔ مگر ارکان کمیٹی کو پھر یاد آیا کہ اس طرح تو زیادہ بچے پیدا ہونے کا خدشہ ہے جس سے منصوبہ بندی والا پروگرام

دھرے کا دھرا رہ جائے گا۔ چنانچہ اس مشکل کا جو حل کمیٹی نے اپنی رپورٹ کی دفعہ ۱۰۱ میں پیش کیا ہے وہ ملاحظہ ہو:۔

"کمیٹی کا نقطہ نظر یہ ہے کہ اس امر کا کوئی جواز نظر نہیں آتا کہ ایسے صنعتی و تجارتی اداروں میں کام کرنے والی عورتوں کو انتفاعاتِ زچگی کیوں نہ میسر ہوں جہاں پر دس سے زیادہ افراد کام کرتے ہیں۔ تاہم کمیٹی ایسے انتفاعات کو بلا روک ٹوک وسعت دینے سے خاندانی منصوبہ بندی کے پروگرام پر اس کے اثرات سے آگاہ ہے۔ اس لیے اس کے خیال میں ایسے انتفاعات تین سے زائد زچگیوں کے لیے نہیں دینے چاہییں"۔

بہتر یہ ہوتا کہ کمیٹی خاندانی منصوبہ بندی کے ذمہ دار حضرات سے بھی اچھی طرح مشورہ کر کے ہدایات لے لیتی، کیونکہ ہمارے خیال میں تو تین بچوں کی یکے بعد دیگرے پیدائش کو نہ صرف گوارا کر لینا بلکہ اس پر عورت کو "انتفاعات زچگی" کی ترغیب و تشویق مہیا کر دینا خاندانی منصوبہ بندی کے اغراض و مقاصد سے پوری طرح ہم آہنگ نہیں ہے۔ اس کے بجائے ہونا تو یہ چاہیے کہ دس سال سے کم میں اگر عورت ایک اور بچے کو جنم دے بیٹھے تو اُس پر جرمانہ کیا جائے، یا اُس کی تنخواہ کم کر دی جائے، یا کم از کم اسے مراعات سے محروم کر دیا جائے۔ شاید پہلے مرحلے میں کمیٹی نے اتنی دور تک جانا مناسب نہ سمجھا ہو اور اسے دوسرے مرحلے کے لیے اُٹھا رکھا ہو۔

حقوق نسواں کمیٹی چونکہ اسلام کا نام بھی بار بار لیتی ہے، اس لیے آخر میں ہم ایک ضروری شرعی مسئلے کی طرف اُسے متوجہ کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ کسی خاتون کے خاوند کا خدانخواستہ انتقال ہو جائے تو اُس پر شرعاً لازم ہے کہ وہ اپنی عدتِ وفات اپنے اور اپنے متوفّٰی شوہر کے گھر میں گزارے اور ضرورت شدید کے بغیر گھر سے باہر نہ نکلے۔ مروجہ قانون میں اس امر کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ ایسی خاتون اگر ملازم ہو تو اسے اس عدت کے لیے رخصت دی جائے جس کی مدت غیر حاملہ کے لیے چار ماہ دس دن اور حاملہ کے لیے وضع حمل تک ہے۔ یہ ایک سنگین فروگذاشت ہے۔ ہمارے علم میں بعض ایسی خواتین ہیں جو شرعی حدود و قیود کے ساتھ مثلاً زنانہ درسگاہ میں معلّمہ تھیں ــــ ان کے ساتھ یہ سانحہ پیش آیا ــــ انہوں نے عدت گزارنے کے لیے رخصت طلب کی مگر صاف انکار کر دیا گیا۔ جس نظامِ حکومت میں بیوہ کا یہ صریح اسلامی حق پامال کیا جا رہا ہے، اس کے ارباب حل و عقد کس منہ سے اسلامی نسوانی حقوق کی علم برداری کا دعویٰ کر سکتے ہیں؟